⊙ سید توقیر حسین شاہ (سید توقیر بخاری)
پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد
⊙⊙ محمد دل رُبا خان
ایسوسی ایٹ لیکچرر، شعبہ اردو، دی اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور (بہاولنگر کیمپس)

جوشؔ ملیح آبادی کی انقلابی شاعری کا تنقیدی مطالعہ

Abstract:

Josh Malihabadi is a famous poet of urdu literature. His poetry is based on many topics i.e politics, moralities, religion, romance and love of nature etc. Through his poetry, he also motivated the people of sub-continent to get freedom from british rulers. When we compare Josh Malihabadi to other poets, we find that Josh is different from all poets on the basis of his political poetry. That's why, according to his revolutionary thoughts, he was given the title of Shair-e-Inqbilab. In this article, his revolutionary poetry is thoroughly discussed. Moreover, some critical views of famous critics are also includedin this regard.

Keywords:

Poetry, Revolution, Freedom, Criticism, Josh

ایک شاعر یا ادیب معاشرے کا حساس فرد ہوتا ہے۔ وہ اپنے اطراف و اکناف کے ماحول اور معاشرتی حالات کا نہ صرف اثر قبول کرتا ہے بلکہ فکری اعتبار سے بہ ذاتِ خود بھی معاشرے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اردو شاعری کے دامن سے کئی ایسے آفاقی شاعر وابستہ ہیں جو فی نفسہٖ ایک مکمل دبستان کا درجہ رکھتے ہیں۔ جنھوں نیا اردو شاعری کو ایک نیا آہنگ عطا کیا اور انقلابِ دہر میں حالات سے سمجھوتہ کرنے کے بجائے سیسہ پلائی دیوار بن گئے۔ ہر عہد کی شاعری، سیاسی و سماجی حالات کی غماز اور ترجمان ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو زبان نے اپنی ابتدا سے لے کر بیسویں صدی کے اختتام تک کئی کروٹیں بدلی ہیں اور مختلف تحریکوں کے ساتھ وابستہ ہو کر اپنے موضوعات میں بے پناہ اضافہ کیا ہے۔ یہ تحریکیں ادبی ہونے کے باوجود سیاسی حالات سے محفوظ نہ رہ سکیں اور ہر تحریک، ماقبل تحریک کے ردِ عمل کے طور پر ظہور پذیر ہوئی ہے۔

اردو کی ادبی تاریخ کا مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ علی گڑھ تحریک نے ادب کو بہ طورِ آلہٴ کار استعمال کیا ہے

جس کا نقصان یہ ہوا کہ اردو ادب سے جمالیاتی عناصر مفقود ہو گئے۔علی گڑھ تحریک کے جواب میں رومانوی تحریک اور بعد ازاں ترقی پسند تحریک کی ابتدا نے ادب کو کئی موضوعات اور جہات سے روشناس کروایا ہے۔رومانوی تحریک اور ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر لکھنے والوں میں جوشؔ ملیح آبادی (۱۸۹۸ء-۱۹۸۲ء) کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔جوشؔ ملیح آبادی کی یہ انفرادیت مسلّم ہے کہ ان کی شاعری میں رومانویت اور ترقی پسندیت کا امتزاج پایا جاتا ہے۔

ترقی پسند تحریک نے ادب کا رخ مسائلِ حیات کی طرف موڑ کر ادبا و شعرا کو معاشرتی مسائل کا ترجمان بنا دیا۔ بلا شبہ اس عہد کے ادیبوں اور شاعروں کے نزدیک برصغیر کا سب سے بڑا مسئلہ آزادی کا حصول تھا۔اس سلسلے میں نامساعد حالات کے باوجود انفرادی و اجتماعی کوششیں بتدریج تیز ہو رہی تھیں۔مزید برآں، انگریزوں کے مظالم اور سختیاں بھی لوگوں کے جذباتِ حصولِ آزادی کو ابھارنے کا سبب بن رہی تھیں۔حصولِ آزادی کے اس کارواں میں جوشؔ ملیح آبادی پیش پیش نظر آتے ہیں۔ بدامنی اور انتشار کے اس زمانے میں جوشؔ نے انجام کی پروا کیے بغیر حکومتِ وقت کے خلاف بڑی بے باکی سے احتجاج کیا ہے۔ان کے احتجاج میں سسکیوں اور آہوں کے بجائے فولادی قوت اور بے پناہ گھن گرج پائی جاتی ہے۔ جوشؔ کا تعلق ملیح آباد کے ایک رئیس گھرانے سے تھا اور اس پر مستزاد یہ کہ وہ ایک قادر الکلام شاعر تھے اس لیے انھیں حلقۂ عوام میں بہت جلد مقبولیت حاصل ہو گئی۔

کلامِ جوشؔ کی کئی جہتیں ہیں جن پر ناقدینِ ادب نے مختلف آرا کے ساتھ خامہ فرسائی کی ہے۔ان میں سے ایک جہت ان کی انقلابی شاعری کی ہے۔جوشؔ ملیح آبادی کی انقلابی شاعری نے قارئینِ ادب کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک گروہ انھیں بلا شرکتِ غیرے، شاعرِ انقلاب کے لقب سے پکارتا ہے اور دنیائے ادب میں اسی لقب کو جوشؔ کا طغرائے امتیاز قرار دیتا ہے جبکہ دوسرا گروہ انھیں سرے سے انقلابی شاعر ہی نہیں مانتا۔حقیقت یہ ہے کہ جوشؔ کی شاعری میں بعض ایسے موضوعات اور افکار پائے جاتے ہیں جنھوں نے جوشؔ کو ایک متنازعہ شخصیت اور شاعر بنا دیا۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جوشؔ کے شاعرانہ محاسن بھی ان تنازعات کے بوجھ تلے دب کر رہ گئے ہیں جن کا سب سے زیادہ نقصان بھی جوشؔ ہی کو ہوا ہے۔ بہر حال، ان فکری اختلافات سے قطعِ نظر، اس آرٹیکل میں جوشؔ ملیح آبادی کی انقلابی شاعری ہی کو زیرِ بحث لایا جائے گا:

صاحبِ فرہنگِ آصفیہ نے لفظ انقلاب کے معنی تغیر و تبدل، الٹ پلٹ، الٹ پھیر، دور اور گردش درج کیے ہیں(۱)۔گویا انقلاب ایک ایسی تبدیلی کا نام ہے جو پرانے نظام کو یکسر بدل کر رکھ دے۔اس ردوبدل میں پرانے نظام سے بغاوت اور روگردانی کے عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ بہ الفاظِ دگر، احتجاج، مزاحمت اور بغاوت کے درجہ انتہا کا نام انقلاب ہے۔اگر کسی نظام میں انقلاب برپا نہیں ہوتا تو احتجاج، مزاحمت اور بغاوت بھی اپنی معنویت کھو دیتے ہیں۔ویسے تو انقلاب کا تعلق زندگی کے ہر میدان اور ہر شعبے سے ہے لیکن بہ طورِ خاص اسے نظامِ سیاست وحکومت کے ساتھ مربوط کیا جاتا ہے۔اسی طرح انقلابی شاعری سے مراد وہ شاعری لی جاتی ہے جس میں عوام الناس کو کسی عظیم مقصد کے حصول کے لیے متحرک اور سرگرم کیا جائے۔اس صدائے انقلاب میں عام طور پر جنگ و جدل اور قتل و خونریزی کی علامتیں استعمال کی جاتی ہیں تاکہ ممکنہ کامیابی کے لیے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جائے۔

جوشؔ ملیح آبادی کے کلام کا ایک بڑا حصہ اسی قبیلِ سخن سے تعلق رکھتا ہے۔یہی وہ بازگشت ہے جو شاعرِ مشرق

علّامہ محمد اقبال کے کلام میں سنائی دیتی ہے۔ اگرچہ وقت کے ان دونام ور شاعروں کا اسلوبِ بیان جداگانہ تھا لیکن منزل مشترک تھی۔ قبل اس کے کہ جوشؔ ملیح آبادی کی انقلابی شاعری کے متعلق تبصرہ کیا جائے، اندریں ضمن سطورِ ذیل میں چند ناقدینِ ادب کی مختلف ومتضاد آرا درج کی جاتی ہیں:

رشید حسن خاں کے نزدیک:

''اُن کی وہ پرشور نظمیں جن کو کچھ لوگ احتجاجی شاعری کے ذیل میں رکھتے ہیں اور کچھ لوگ اُن پر انقلابی شاعری کی تہمت لگاتے ہیں، اُن کی تاریخی حیثیت جو بھی ہو اور ماضی میں اُن کا احوال جو بھی رہا ہو؛ آج یا تو وہ بہت کم متاثر کرتی ہیں یا بالکل متاثر نہیں کرتیں۔''(۲)

انیسؔ سلطانہ کے بقول:

''وہ واضح تبدیلی جو تدریجی ارتقا سے سے گذرے بغیر وجود میں آجائے، انقلاب پذیر ہوسکتی ہے۔ اسی کو ہم انقلاب کا نام دیں گے۔ جوشؔ کے یہاں ایسی کوئی تبدیلی نہیں۔ ان کے سامنے کوئی واضح نصب العین نہیں ہے۔ ان کے یہاں زندگی منقلب تو ہوسکتی ہے لیکن انقلاب کے بعد وہ کیا رنگ اختیار کرے گی، اس سے وہ خود ہی آگاہ نہیں ہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ جوشؔ کی یہ انقلابی نظمیں آزادی کی تحریک کی ترجمان ہیں اور ہماری گذشتہ سیاسی زندگی کے ہیجان کو پوری طرح واضح کرتی ہیں۔''(۳)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''بعض حضرات، جوش کو شاعر انقلاب تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا اعتراض یہ ہے کہ جوش کے پاس انقلاب کا کوئی مربوط فلسفیانہ تصوّر نہیں ہے، وہ صرف رومانی تصورات ہی کو انقلاب سمجھتے ہیں۔ لیکن کسی شاعر کے انقلابی ذہن کو اس طرح جانچنا پرکھنا درست نہیں ہے۔''(۴)

ڈاکٹر محمد حسن، جوشؔ کے تصورِ انقلاب کے متعلق یوں رقم طراز ہیں:

''جوشؔ کو "شاعرِ انقلاب" کہا جاتا ہے۔ کسی حد تک یہ بات صحیح بھی ہے۔ انھوں نے ایسے وقت میں آزادی کے نغمے اَلا پا اور نعرے بلند کئے جب برطانوی استبداد اس قسم کی باتیں کرنے والے کے لئے عرصۂ حیات تنگ کردیتا تھا...... جوشؔ کا تصور انقلاب سیاسی سے زیادہ جذباتی ہے۔''(۵)

پروفیسر گوپی چند نارنگ کہتے ہیں:

''آزادی کے ترانے چھیڑنے والوں میں جوشؔ اکیلے نہیں تھے۔ شبلیؔ، حسرتؔ موہانی، چکبستؔ، اکبرؔ الہ آبادی، اقبالؔ، ظفر علی خاں، اقبال سہیل اور کئی دوسرے شعرا سامراج دشمنی کی فضا تیار کر چکے تھے لیکن جوشؔ کی آواز جوش کی آواز تھی۔ اُن کی باغیانہ تڑپ اور گھن گرج سب سے الگ تھی۔ شاعرِ انقلاب کہلانے کا اعزاز کسی کو ملا تو صرف جوشؔ کو۔''(۶)

مصطفیٰ زیدی، جوشؔ کے تصورِ انقلاب کو محض بغاوت سے تعبیر کرتے ہیں:

''جوشؔ کے انقلاب نے ہمیں اسی لئے اپنی طرف فوراً متوجہ کرلیا کہ جس نظریے کو ہم "بہت بڑی بغاوت" سمجھتے تھے، اسے جوشؔ نے بلند آواز، بلند آہنگ اور شعری شدت کے ساتھ بیان کرنا شروع کر دیا تھا......اور اس طرح یہ ہوا کہ جوشؔ خود اپنے آپ کو "انقلاب" کا "پیغمبر" اور اپنے کلام کو "صحیفہ" سمجھنے لگے۔''(۷)

کلیم الدین احمد کے خیال کے مطابق:

''جوشؔ کی انقلابی نظموں میں بھی وقتی اور سطحی باتیں ہیں، چیخ پکار ہے، زور ہے شعریت نہیں۔''(۸)

جوشؔ ملیح آبادی ملیح آبادی کے لیے شاعرِ انقلاب کا لقب سب سے پہلے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے ۱۹۳۰ء میں اپنے اخبار "ہند" میں استعمال کیا ہے(۹)۔اس لقب کے پسِ منظر میں جانا ضروری ہے۔ جوشؔ کا سب سے پہلا شعری ونثری مجموعہ روحِ ادب ۱۹۲۰ء میں طبع ہوا ہے اور سولہ سال کے طویل عرصے کے بعد ان کے دو مجموعے نقش ونگار اور شعلہ وشبنم شائع ہوئے ہیں۔روحِ ادب اور نقش ونگار میں شامل کلام تو جوشؔ کی انقلابیت پر دلالت نہیں کرتا البتہ شعلہ وشبنم میں شامل کلام کا بڑا حصہ انقلابی شاعری پر مشتمل ہے۔ اگر جوشؔ ملیح آبادی کے جملہ مجموعہ ہائے کلام کا من حیث المجموع جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جوشؔ کی سب سے زیادہ انقلابی شاعری بھی شعلہ وشبنم میں شامل ہے۔ الغرض! شعلہ وشبنم کی اشاعت سے چھے سال قبل جوشؔ کو شاعرِ انقلاب کا لقب ملنے کا مطلب یہ ہوا کہ شعلہ وشبنم میں شامل انقلابی نظمیں، رسالوں اور مشاعروں کی وساطت سے طباعت سے پہلے ہی زبان زدِ عام ہو چکی تھیں اور برصغیر کی تحریکِ آزادی کا حصہ بن چکی تھیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب برصغیر کے کونے کونے میں حصولِ آزادی کے نغمے گونج رہے تھے اور یہ صورتِ حالات، انقلابی شاعری کے لیے انتہائی موزوں اور سازگار تھی۔ جوشؔ نے شاعرانہ بصیرت سے کام لیتے ہوئے روایتی شاعری سے قطع نظر، آزادیٔ ہند کو موضوعِ سخن بنایا اور نتیجتاً انھیں عوامی سطح پر بے حد پذیرائی حاصل ہوئی۔ یاد رہے کہ جوشؔ کا یہ انفرادی تجربہ نہیں تھا بلکہ یہ ایک اجتماعی رجحان تھا جس نے ادیبوں اور شاعروں کے قلم کا رُخ آزادی کی طرف موڑ دیا تھا۔ جوشؔ نے چونکہ خصوصیت کے ساتھ اس موضوع پر کلام کیا ہے اس لیے انھیں حلقہ عوام وخواص میں شاعرِ انقلاب کے لقب سے سرفراز کیا گیا۔

اس میں کوئی دوسری رائے نہیں کہ جوشؔ نے تحریکِ آزادی ہند میں ایک شاعر کی حیثیت سے اپنا حصہ ضرور ڈالا ہے اور اس وقت کے زعمانے ان کی ادبی خدمات کا اعتراف بھی کیا ہے۔ اس کی سب سے محکم دلیل یہ ہے کہ انگریز حکومت کے کارندے بہ حکمِ سرکار، جوشؔ کی انقلابی نظموں کو ضبط کرنے کے لیے متحرک رہتے تھے۔ جوشؔ کی انقلابی شاعری کا سلسلہ ۱۹۴۷ء تک پورے زور وشور سے جاری رہا جب کہ ۱۹۴۷ء سے لے کر وفات تک کا زمانہ، جوشؔ کی زندگی کے امتحانات کا زمانہ ہے اور ان امتحانات کے کئی اسباب ہیں۔ اس عرصۂ حیات میں جوشؔ کی انقلابی شاعری کے اہداف اور اغراض ومقاصد قدرے مختلف نظر آتے ہیں۔

جوشؔ کی انقلابی شاعری پر اعتراضات کا باقاعدہ سلسلہ تقریباً ۱۹۶۳ء میں یعنی شعلہ وشبنم کی طباعت کے ستائیس

(۲۷) برس بعد شاہد احمد دہلوی کے رسالے ساقی کے جوشؔ نمبر کی اشاعت سے شروع ہوا۔ شاہد احمد دہلوی کا یہ رسالہ دراصل صہبا لکھنوی کے رسالے افکار (۱۹۶۰ء) کے جوشؔ نمبر کے جواب میں شائع ہوا تھا۔ اگر انصاف کے تقاضے پورے کیے جائیں تو ساقی کا مطالعہ کرتے ہوئے بیش تر صفحات سے تعصب کی بو آتی ہے۔ ستائیس برس بعد جوشؔ کی انقلابی شاعری کا تمسخر اڑانے والے یہ نہیں دیکھتے کہ جب ظلم و ستم کا بازار گرم ہو، جب حق گو کے سر پر تلوار سایہ فگن ہو اور جب زبان سے آزادی کا لفظ ادا کرنے والوں کو بغاوت کے جرم میں قید و بند کی صعوبتیں جھیلنا پڑ رہی ہوں، اس وقت مصلحت اندیشی سے کام لینے کے بجائے قوم میں آزادی کی روح پھونکنا اور فریقِ مخالف کو بہ بانگِ دہل للکارنا کتنے جان جوکھوں کا کام ہے۔ کیا جوشؔ نے یہ فریضہ انجام نہیں دیا؟ اپنے ذاتی اختلافات کا انتقام لینے کے لیے کسی شاعر یا ادیب کے ادب پاروں کو جواز بنانا کہاں کا انصاف ہے؟ ہر شاعر اور شاعری کو اس کے مخصوص پسِ منظر سے ہٹ کر دیکھا جائے تو غلط فہمیاں جنم لیتی ہیں۔

جوشؔ ملیح آبادی کی انقلابی شاعری کو تسلیم نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ جوشؔ کے یہاں انقلاب کا کوئی فلسفیانہ تصور نہیں پایا جاتا اور جوشؔ انقلاب کے بعد پیدا ہونے والے حالات کا کوئی نقشہ پیش نہیں کرتے۔ جوشؔ ایک شاعر تھے اور ان کی انقلابی شاعری کو ایک شاعر کی للکار یا پکار کا درجہ دینا چاہیے۔ جوشؔ کی ان شاعرانہ مساعی کے پیشِ نظر، مستقبل میں کوئی سیاسی عہدہ یا وزارت حاصل کرنا نہیں تھا کہ وہ مشقِ سخن کے ساتھ ساتھ آزادی ہند کے مابعد حالات کا گوشوارہ بھی مرتّب کرتے۔ ہر شاعر کے لیے فلسفی ہونا ضروری نہیں اور ویسے بھی جب معاشرے کا ہر فرد اپنے آنے والے کل کے حوالے سے بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا ہو تو اس وقت جان کی امان ہی سب سے مقدم فریضہ ہوتی ہے۔ ان حالات میں اگر کوئی شخص اپنی جان کی پروا کیے بغیر قوم کے افراد کو قوتِ مخالف کے خلاف مستعد و متحرک کرتا ہے تو یہ بڑی بات ہے۔ اصل میں جوشؔ ملیح آبادی کے بارے میں غلط فہمی تب پیدا ہوتی ہے جب ناقدین، جوشؔ کا موازنہ علاّمہ اقبالؔ سے کرتے ہیں۔ معدودے چند موضوعات کے علاوہ شاعرانہ حیثیت سے جوشؔ اور اقبالؔ میں تقابل کرنا درست نہیں کیوں کہ دونوں کی فکر، اسلوب اور ابلاغ میں بڑا فرق ہے۔

جو لوگ جوشؔ کو باغی شاعر قرار دے کر انھیں انقلابی شاعر ماننے سے انکار کرتے ہیں ان کے نزدیک انقلاب کا تصور بہت بے ضرر ہے۔ حصولِ آزادی کے انقلاب میں جان ہتھیلی پر رکھنا ہی شرطِ اوّلین ہوتی ہے۔ ہر وہ شخص باغی قرار دیا جا سکتا ہے جو کسی رائج الوقت نظامِ حکومت کا انکار کرے، اس کے خلاف منصوبہ بندی کرے یا دیگر لوگوں کو بھی اس کی ترغیب دلائے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری تاریخ کی کتابوں میں ۱۸۵۷ء کی جنگ کو جنگِ آزادی لکھا گیا ہے جبکہ انگریز اسے غدر یعنی بغاوت کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ "بغاوت" ایک ایسے سفر کا نام ہے جس کی منزل "انقلاب" کہلاتی ہے۔ ضروری نہیں کہ بغاوت کرنے والا ہر شخص انقلاب کی منزل پر پہنچ جائے کیوں کہ اس خونی راستے میں جان و مال کی قربانی کے دریا عبور کرنے پڑتے ہیں۔ بغاوت کے بغیر انقلاب کے تصور کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ جوشؔ ایک باغی شاعر ہیں اور ان کی بغاوت کا سرا بہر طور انقلاب سے ملتا ہے۔ صرف جوشؔ ہی کا کیا مذکور، ہر وہ شخص جو آزادی ہند کے لیے متحرک اور برسرِ پیکار تھا، بغاوت کی فہرست میں شامل ہے۔

جن ناقدین کے نزدیک جوشؔ کی انقلابی شاعری چیخ پکار ہے، وہ بھی ٹھیک کہتے ہیں۔ ملک جب حالتِ جنگ

میں ہوتا ہے تو کسی ہم وطن کو غفلت کی نیند سے جگانے کے لیے اس کی بیداری کا انتظار نہیں کیا جاتا بلکہ اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر آزادی کے نغمے، ترنم سے نہیں بلکہ گھن گرج سے سنائے جاتے ہیں۔ جوشؔ کی چیخ پکار اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ وہ اپنی قوم کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لیے جھنجھوڑ رہے ہیں۔ اس وقت کئی ایسے شاعر بھی ہوں گے جنھوں نے دعوتِ انقلاب دینے یا بہ ذاتِ خود انقلاب کا حصہ بننے کے بجائے گوشہ نشینی یا زباں بندی ہی میں عافیت جانی ہوگی۔ اگر جوشؔ بھی مصلحت سے کام لیتے ہوئے تحریکِ آزادی کے لیے ایک لفظ بھی نہ لکھتے تو انھیں کس نے پوچھنا تھا۔ لیکن جوشؔ نے ایسا نہیں کیا کیوں کہ انھیں اپنے ہم وطن عزیز تھے۔ ایک ماں اپنے بچے کو سُلانے کے لیے لوری دیتی ہے اور جب اس کا بچہ نادانستی میں بلند و بالا چھت کے کنارے سے زمین کی طرف جھکا ہوا ہوتا ہے تو وہی ماں چیخ چیخ کر اسے پیچھے ہٹا رہی ہوتی ہے۔ اس محل پر ماں کی چیخ پکار اور ڈانٹ ڈپٹ کا ہر گز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ اپنے بچے سے نفرت کرتی ہےبلکہ درحقیقت وہ اس انجام سے خوف زدہ ہوتی ہے جس سے اس کا بچہ آگاہ نہیں ہوتا۔ بعینہٖ ایک حقیقی شاعر بلند نظر بھی ہوتا ہے اور عمیق النظر بھی۔ وہ بھی اپنے ہم وطنوں کو اس نقصان سے بچانا چاہتا ہے جس کے سبب وہ ہمیشہ کے لیے غلامی کی زنجیروں میں جکڑے جا سکتے ہیں۔ جوشؔ کی انقلابی شاعری کا لہجہ تلخ مگر مبنی بر خلوص ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جوشؔ اپنے تخلص کے موافق اپنی قوم کے افراد کو مخاطب کرتے ہوئے اکثر جذباتی ہو جاتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ لوگوں کی بے حسی اور بے پروائی ان کے جذبات کو مشتعل کرتی ہے۔

معترضین جوشؔ نے کلامِ جوشؔ پر کچھ فنی اعتراضات بھی کیے ہیں۔ لیکن ظلم یہ کیا ہے کہ چند مصرعوں کو بنیاد بنا کر جوشؔ کی تمام شاعرانہ خوبیوں پر پانی پھیر دیا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ کلامِ جوشؔ کا مطالعہ کرتے ہوئے بعض جگہوں پر اختصار پسندی کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جوشؔ طبعاً بسیار گوئی کے دل دادہ تھے۔ بعض اوقات تو وہ اپنا مدّعا ایک شعر میں بیان کرتے ہیں جبکہ اس کی تمہید میں درجنوں اشعار لکھ دیتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جوشؔ نے بہت لکھا ہے اور یہ حقیقت بھی مسلّمہ ہے کہ جس شاعر کی نظر مقدار پر ہوتی ہے، اس کے کلام میں کہیں کہیں معیاری اسقام کا پایا جانا ایک فطری عمل ہے۔ فطرتِ جوشؔ کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ جوشؔ نے اپنے مجموعوں پر نظرِ ثانی کے لیے زیادہ سنجیدگی سے کام نہیں لیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بعض ناقدین نے جوشؔ کے وسیع کلام میں سے چند مصرعے نکال کر انھیں بہت معمولی اور بے ہنر شاعر ثابت کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

ابتدائی مباحث کے بعد آئندہ سطور میں جوشؔ ملیح آبادی کی انقلابی شاعری کا شعری امثال کے ذریعے جائزہ لیا جائے گا تا کہ ناقدینِ کرام کی حمایت و مخالفت پر مبنی مندرجہ بالا آرا کے تناظر میں کلامِ جوشؔ کی حقیقی انقلابی حیثیت دریافت کی جا سکے۔ جوشؔ ملیح آبادی کے انقلابی رجحانات کے تعارف کی ابتدا علی العموم جوشؔ کے درجِ ذیل زندہ جاوید شعر سے ہوتی ہے:

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

شعلہ و شبنم (۱۰)

جوشؔ کے تصورِ انقلاب کی بنیاد مشاہدے پر ہے۔ وہ برصغیر کی سیاسی صورتِ حال اور اپنی قوم کے افراد کو ایک خاموش تماشائی کی طرح دیکھتے ہیں۔ دردمندی کا احساس انھیں محکوم ومغلوب قوم کی رہبری کی طرف مائل کرتا ہے۔ جوشؔ کے تصورِ انقلاب کو حقیقی تقویت ان کے رومانوی مزاج کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ رومانوی شاعر کی حیثیت سے زمینی حقائق کا مشاہدہ، انھیں صدائے انقلاب بلند کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ ۱۹۲۶ء میں جوشؔ ایک دوشیزہ کو سڑک پر مزدوری کرتے ہوئے دیکھ کر بے تاب ہو جاتے ہیں کہ جس صنفِ نازک کو ناز و انداز کے ساتھ چار دیواری کی زینت ہونا چاہیے تھا وہ حالات کی ماری ہوئی سڑک پر کنکر توڑ رہی ہے۔ یہ منظر جوشؔ کے دل میں ایک نیا عزم پیدا کرتا ہے کہ:

دستِ نازک کو رسن سے اب چھڑانا چاہیئے
اس کلائی میں تو کنگن جگمگانا چاہیئے
(نظم: حُسن اور مزدوری، شعلہ وشبنم، ص۲۰)

اہلِ ہندوستان کی بے چارگی کا احساس اور انگریز حکمرانوں کی غاصبانہ حکومت کا غصہ، جوشؔ کو بارگاہِ ایزدی میں یوں فریاد کناں ہونے کی رغبت دلاتا ہے:

اے خدا! ہندوستاں پر یہ نحوست تا کُجا؟
آخر اِس جنّت پہ دوزخ کی حکومت تا کُجا؟
(نظم: حُسن اور مزدوری، شعلہ وشبنم، ص۱۹)

۱۹۲۹ء میں لکھی گئی نظم ''پیر زن'' میں ہندوستان کی لڑکیوں کو مشن سکول کی ایک انگریز عورت سے محتاط رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ جوشؔ کے نزدیک، اس عورت کی وضع قطع اور چال ڈھال ایک دامِ فریب ہے جس کے ذریعے وہ ہندوستانی لڑکیوں کو ان کی تہذیب سے دور کرنا چاہتی ہے۔ ۱۹۳۰ء میں لکھی گئی نظم ''بادشاہ کی سواری'' میں جوشؔ نے ایک ساٹھ سالہ مریض بڑھیا کا احوال بیان کیا ہے کہ کس طرح اس بڑھیا کو بادشاہ کی شان وشوکت اور استقبال کے راستے میں ایک رکاوٹ سمجھ کر اس قدر بے دردی سے ہٹایا گیا کہ اس کی موت واقع ہو گئی۔ ان حالات نے سینہ جوشؔ میں مخفی انقلاب کے شعلوں کو ہوا دی اور وہ میدانِ عمل میں آ گئے۔ جوشؔ کی انقلابی شاعری کا اگلا مرحلہ، قوم کو غلامی کی زندگی سے نجات دلانا اور آزادی کے لیے کوشاں کرنا ہے۔ نظم ''لمحہ آزادی'' (۱۹۳۱ء) میں جوشؔ، محکومی اور غلامی کی زندگی کے نقصانات کے ساتھ ساتھ آزادی کی اہمیت بیان کرتے دکھائی دیتے ہیں:

سُنو اے بستگانِ زلفِ گیتی
نِدا کیا آ رہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر
غلامی کی حیاتِ جاوداں سے
(شعلہ وشبنم، ص۱۵)

۱۹۳۲ء میں جوشؔ اپنی قوم کے ہر فرد کو یوں نصیحت کرتے ہیں:

پَست سے پَست ہو جو چیز، وہ بن جا لیکن
مَر کے بھی جنسِ غلامی کا خریدار نہ بن
(نظم ''خریدار نہ بن''، شعلہ وشبنم، ص۷۰)

انقلابی شاعری کا اصل مقصد، قوم میں انقلاب کی روح پھونکنا ہوتا ہے۔ اس کے لیے سب سے زیادہ نوجوان طبقے ہی کو مخاطب کیا جاتا ہے کیونکہ تاریخی شہادتوں اور حقیقتوں سے یہ بات مسلّم الثبوت ہے کہ قوموں کی تقدیر بدلنے میں نوجوان نسل کا بڑا کردار رہا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ایک بڑے پیمانے پر ایثار کی صورت میں نوجوان نسل ہی کا لہو رنگ لاتا ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے جوشؔ اپنی قوم کے نوجوانوں سے پُر جوش انداز میں خطاب کرتے ہیں۔ جوشؔ انھیں وطن کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے کی رغبت دلاتے ہیں اور ان کی خوابیدہ غیرت و حمیّت کو بیدار کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں جن کی جھلک درجِ ذیل اشعار میں صاف ظاہر ہے۔

اے بھڑکتی آگ! ٹھنڈی راکھ کی تہ سے نکل
اے رگِ غیرت! اُبھر اے خاک کے چشمے اُبل
(بھُوکا ہندوستان، ۱۹۳۰ء، شعلہ وشبنم، ص۸۶)

☆

نوجوانو! خُون، جینے کے لئے تھوڑا سا خُون
خُون کی پیاسی ہے مدت سے وطن کی سرزمیں
(ایک شہیدِ وطن کی یاد میں۔۱۹۳۰ء، شعلہ وشبنم، ص۱۵)

جوشؔ ملیح آبادی نے اپنے شہرہ آفاق مرثیے ''حسین اور انقلاب'' میں آہ و بکا پر مشتمل روایتی مضامین سے ہٹ کر حضرت امام حسینؑ کی عظیم قربانی کو ایک علامتِ انقلاب کے طور پر پیش کیا ہے۔ جوشؔ کے نزدیک حضرت امام حسینؑ کی شخصیت اور کردار، ہر دور میں قوتِ باطل کے خلاف علمِ حق بلند کرنے والوں کے لیے بہترین نمونہ ہے۔ اس طویل مرثیے کی بنیاد پر، آخری حصے میں جوشؔ اپنی قوم کو دعوتِ انقلاب دیتے ہوئے کہتے ہیں:

اے حاملانِ آتشِ سوزاں، بڑھے چلو
اے پیروانِ شاہِ شہیداں، بڑھے چلو
اے فاتحانِ صَرصَر و طوفاں، بڑھے چلو
اے صاحبانِ ہمّتِ یزداں، بڑھے چلو (۱۱)

جوشؔ ملیح آبادی کی انقلابی شاعری میں ایک اور چیز بڑی نمایاں ہے اور وہ ہے برصغیر پر قابض انگریز حکمرانوں سے نفرت کا اظہار۔ جوشؔ نے اپنی قوم کو متحرک کرنے کے ساتھ ساتھ انگریزوں کو اس طرح للکارا کہ جوشؔ کی آواز انگریز حکمرانوں کے لیے، دردِ سر بن گئی۔ جوشؔ پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ انھوں نے وطن کی خاطر دوسروں کو تو مرنے مارنے کی رغبت دلائی لیکن خود ان کے دامن پر خونِ آزادی کا ایک چھینٹا بھی نظر نہیں آتا۔

اگر اس جواز کو ذرا سی بھی اہمیت دی جائے تو معاصرِ جوشؔ علّامہ اقبال کی تمام انقلابی شاعری بھی مصنوعی ظاہر ہونے لگے گی۔فی الحقیقت شاعر کے لیے لازم نہیں کہ وہ میدانِ جنگ میں تیر وتفنگ کے ذریعے اپنی جوانمردی کے جوہر بھی دکھائے بل کہ اس کی حیثیت تو ایک محرک کی ہوتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ایک شاعر کی انقلابی آواز، کئی تلواروں اور شہسواروں سے زیادہ کارگر ثابت ہوتی ہے۔

جوشؔ کی عوامی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی مضبوط (ضبط شدہ) انقلابی نظمیں لوگوں نے ازبر کر لی تھیں اس لیے محفوظ رہ گئیں اور بعد میں انھیں دوبارہ شائع کرنے کے لیے کسی دقّت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ۱۹۳۰ء میں جب لکھنو کے ایک غیر مسلح مجمعے پر پولیس نے ناحق گولیاں چلا کر کئی معصوم لوگوں کو قتل کر دیا تو جوشؔ نے اس کے جواب میں اپنے جذبات کا اظہار یوں کیا:

بھیڑیوں کے طور سے اِنساں کا کرتا ہے شکار
خاک ہو جا اے جہاں بانی کے جھوٹے اقتدار
آگ کا بادل، فرازِ چرخ پر چھانے کو ہے
اے حکومت کے چمن بادِ سموم آنے کو ہے
(نظم: چلائے جا تلوار، حرف وحکایت) (۱۲)

جوشؔ ملیح آبادی کی سب سے مقبول ومعروف انقلابی نظم ''شکستِ زِنداں کا خواب'' (۱۹۲۱ء) ہے۔مقبولیت کے ساتھ ساتھ اس نظم نے کچھ ناقدین کو اعتراضات کے مواقع بھی فراہم کیے ہیں لیکن ان اعتراضات کی حیثیت بقولِ میرؔ ''سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنے قصور تھا'' کی سی ہے۔صرف تین اشعار کی روشنی میں وضاحت کی جاتی ہے:

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے گونج رہی ہیں تکبیریں
اُکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
آنکھوں میں گدا کی سُرخی ہی، تو پونکے دہانے ٹھنڈے ہیں
تخریب نے پرچم کھولا ہے، سجدے میں پڑی ہیں تعمیریں
سنبھلو، کہ وہ زنداں گونج اُٹھا، جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اُٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں، دَوڑو کہ وُہ ٹوٹی زنجیریں
(شعلہ وشبنم، ص۱۶)

جوشؔ کی محوّلہ بالا نظم پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں ایک طرف تو جوشؔ اسیرانِ حریت کے عملِ پیہم کی ترجمانی کر رہے ہیں اور دوسری طرف انگریزوں کو قیدیوں کے فرار ہونے کی اطلاع دیتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ بھاگنے والے قیدیوں کو جھپٹ کر دوبارہ پکڑ لو اور زنجیریں توڑنے والوں کو دوڑ کر اپنی حراست میں لے لو۔بادی النظر میں اس نظم کا جو مفہوم اخذ کیا گیا وہ حقیقت کے منافی ہے۔دراصل جوشؔ کا یہ کہنا ہے کہ جن لوگوں کو نعرہ آزادی کے جرم میں گرفتار کیا گیا ہے وہ اپنے میں عزائم اس قدر پختہ ہیں کہ ان کی الوالعزمی کے سبب ان کے پاؤں کی زنجیریں ٹوٹنے والی ہیں۔ان قیدیوں

کی آنکھوں میں جو انقلاب کی سرخی ہے اس نے حاکمِ وقت کے چہرے کو بے نور کر دیا ہے۔ ان قیدیوں کی تخریب سے ظلم و بربریت کی تعمیرات زمین بوس ہونے والی ہیں۔ نظم کے تمام اشعار میں آزادی کے متوالوں کی سرگرمیوں کا احوال بیان کیا گیا ہے جبکہ آخری شعر میں انگریز سرکار سے طنزاً خطاب کیا گیا ہے۔ آخری شعر میں جوشؔ نے مخبری نہیں کی بلکہ انگریز سرکار کے اہل کاروں کو للکارتے ہوئے کہا ہے کہ تم نے جھپٹ جھپٹ کر اور دوڑ دوڑ کر جن لوگوں کو قید کیا تھا، وہ زنجیریں توڑ کر جا رہے ہیں اگر ہمت ہے تو پھر جھپٹو اور دوڑو۔ جوشؔ کا مدعا یہ ہے کہ حصولِ آزادی کے جذبات کو قید و بند کی صعوبتوں سے دبایا نہیں جا سکتا۔ ان جذبات کے سامنے تو آزمائشوں اور سختیوں کے پہاڑ بھی ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔

جوشؔ ملیح آبادی کی انقلابیت کا آخری زاویہ ان کا وہ کلام ہے جسے بنیاد بنا کر بعض ناقدین نے نہ صرف جوشؔ کی تمام انقلابی شاعری کا مذاق اڑایا ہے بلکہ زمانی تقدیم و تاخیر سے صرفِ نظر کرتے ہوئے، قارئین کے لیے کئی غلط فہمیاں بھی پیدا کی ہیں۔ جوشؔ ملیح آبادی نے جب دیکھا کہ ہندوستان کے کچھ لوگ غلامی کی زندگی سے نجات حاصل کرنے کے لیے کوشاں ہی نہیں اور انگریزوں کے ظلم و جبر کے باوجود بے حسی کا شکار ہیں تو جوشؔ نے انھیں برملا لعن طعن کرنا شروع کر دیا۔ واضح رہے کہ اس طرزِ سخن کے مخاطب تمام ہندوستانی نہیں بلکہ صرف وہ ہندوستانی ہیں جو انگریزوں کے وفادار تھے اور جن کے نزدیک جنگ و جدل کے نتیجے میں ملنے والی آزادی سے امن و آشتی کی غلامی ہی بہتر تھی۔ چونکہ وہ بے ضمیر لوگ انگریزوں کے ساتھ ملے ہوئے تھے اس لیے آزادیٔ ہند کے علم برداروں کو کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ جوشؔ کے لب و لہجے کی تلخی اور تنفر کا ہدف بھی یہی لوگ ہیں۔

جوشؔ کے مطابق ''۱۹۳۱ء کا وہ ہنگامہ جس میں خیال تھا کہ فریقین کے ۷۰۰ افراد ہلاک ہوئے''**(۱۳)**۔ اس کے جواب میں جوشؔ نے نظم ''مقتلِ کان پُور'' (۱۹۳۱ء) لکھ کر بہ یک وقت فرنگیوں اور غدّار ہندوستانیوں کے لیے شدید برہمی کا اظہار کیا ہے۔ مذکورہ نظم مخصوص واقعے کے تناظر میں مذمت کے طور پر لکھی گئی ہے لیکن ناقدین نے اسے جواز بنا کر یہ تاثر دیا ہے کہ جوشؔ پوری ہندوستانی قوم کو مخاطب کر رہے ہیں۔ تین اشعار سے یہ قلعی کھل جائے گی:

اے سیہ رُو، بے حیا، وحشی، کمینے، بدگماں
اے جبینِ ارض کے داغ، اے دَنی ہندوستاں
تُجھ پہ لعنت اے فرنگی کے کے غلامِ بے شعُور
یہ فضائے صُلح پرور، یہ قتالِ کان پُور!
دِلمیں کھوٹا پن، ارادوں میں بدی، نیّت خراب
اور سیہ باطن! یہ عالم اور آزادی کا خواب
(شعلہ و شبنم، ص ۵۶)

جوشؔ کے انقلابی سفر میں وہ لمحات بھی آتے ہیں جب وہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی اپنی قوم کی اجتماعی حالتِ زار کو دیکھ کر قنوطیت کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔ قرینِ قیاس یہی ہے کہ ''ذلیل غُلامانِ روسیاہ'' کے الفاظ افرادِ قوم کی بے حسی اور بے پروائی کے نتیجے میں فطری ردِ عمل کے طور پر استعمال کیے گئے ہیں۔

اے ہند کے ذلیل غُلامانِ روسیاہ!
شاعر سے تو ملاؤ خدا کے لئے نگاہ
اَے اُمّتِ شکستہ دل و اے گروہِ شل!
کب سے بُلا رہا ہوں میں تجھکو سوئے عمل

(نظم: غلاموں سے خطاب (۱۹۳۳ء)، شعلہ وشبنم، ص ۳۱)

اس غم وغصہ اور قنوطیت کے باوجود جوشؔ اپنے مقصدِ حریت سے غافل نہیں ہوتے۔ حصولِ آزادی تک ان کی انقلابی آواز برصغیر کی فضاؤں میں برابر گونجتی رہتی ہے۔ ۱۹۴۶ء میں کہی گئی نظم ''دعوتِ انقلاب'' اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ بیسویں صدی کی تیسری دَہائی میں جو قافلۂ انقلاب، جوشؔ ملیح آبادی کی قیادت میں روانہ ہوا تھا، وہ اپنی منزل کے انتہائی قریب ہے:

اُٹھ کہ اِن تارِیکیوں میں سُرخیاں پَیدا کریں
اِس زمیں کی پستیوں سے آسماں پیدا کریں
زَر فِشاں ہیں خونِ دَہقاں سے اُمیروں کے چراغ
اُٹھ، کہ دَہقاں کے نَفَس سے آندھیاں پیدا کریں

(سموم وصبا، ص ۳۳)

ہر شاعر کے ہاں میں اظہارِ جذبات کے ارتقائی عمل کے دوران موضوعات بدلتے رہتے ہیں لیکن جوشؔ ملیح آبادی وہ شاعر ہیں جنھوں نے ایک تواتر کے ساتھ انقلابی شاعری کے ذریعے حبِ وطن کی ترجمانی کی ہے اور لشکرِ آزادی کے لیے ایک علم بردار کا کردار ادا کیا ہے۔ بلاشبہ برصغیر کی انقلابی شاعری کے حوالے سے جوشؔ ملیح آبادی کا نام سرِ فہرست ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سیّداحمد دہلوی، فرھنگِ آصفیہ،(لاہور: مشتاق بک کارنر،۲۰۱۵ء)،ص۱۴۰

۲۔ رشیدحسن خاں، جوش کی شاعری میں لفظ اور معنی کا تناسب،مشمولہ: جوش ملیح آبادی(تنقیدی جائزہ)،(نئی دلّی:انجمن ترقی اردو(ہند)،۱۹۹۲ء)،مرتبہ:خلیق انجم،ص۱۶۶

۳۔ انیس سلطانہ، جوشؔ ایک رومان پرست انقلابی شاعر،مشمولہ:ساقی،جوش نمبر،(کراچی،اٹلانٹس پبلی کیشنز،۲۰۲۰ء)، مرتبہ: شاہداحمد دہلوی،ص۳۷۱

۴۔ فرمان فتح پوری، جوش اور فراق گورکھپوری،(لاہور،الوقار پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء)،ص۴

۵۔ محمدحسن،جوشؔ کی شاعری،مشمولہ: افکار،جوشؔ نمبر،(کراچی: مکتبہ افکار،۱۹۶۱ء)،مرتبہ:صہبالکھنوی،ص۵۳۶

۶۔ گوپی چندنارنگ،شاعرِحریّت وفطرت جوشؔ ملیح آبادی،مشمولہ: جوش ملیح آبادی(تنقیدی جائزہ)،ص۹۳

۷۔ مصطفےٰ زیدی،شبّیرحسن خاں،مشمولہ: افکار،جوشؔ نمبر،ص۴۲

۸۔ کلیم الدین احمد،جوشؔ،مشمولہ:ساقی،جوش نمبر،ص۴۲

۹۔ صہبالکھنوی،افکار،جوشؔ نمبر،ص۱۹

۱۰۔ جوشؔ ملیح آبادی،شعلہ وشبنم،(بمبئی:کتب خانہ تاج آفس)،ص۹

۱۱۔ جوشؔ ملیح آبادی،حرف وحکایت،(لاہور: مکتبہ اردو،۱۹۴۳ء)،ص۲۳-۲۴

۱۲۔ جوشؔ ملیح آبادی،آیات و نغمات،(لاہور: مکتبہ اردو،۱۹۴۴ء)،ص۱۸۳

۱۳۔ جوشؔ ملیح آبادی،شعلہ وشبنم،ص۶۵